R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷، شمارہ ۲۱	ایڈیٹر: آل احمد سرور	یکم جون ۱۹۶۸ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ

دستور کی دفعہ ۳۵۰ بی (۲) کی رو سے لسانی اقلیتوں کے کمشنر کا فرض ہے کہ وہ صدر کو لسانی اقلیتوں کے تحفظات کے سلسلے میں تمام معاملات پر وقتاً فوقتاً رپورٹ دے۔ یہ رپورٹ پارلی منٹ میں پیش ہوتی ہے اور ریاستی حکومتوں کو بھیجی جاتی ہے اب تک سات رپورٹیں صدر کی خدمت میں پیش ہو کر پارلی منٹ کے سامنے رکھی جا چکی ہیں اور پارلی منٹ میں ان پر بحث ہو چکی ہے۔ آٹھویں رپورٹ مئی کے مہینے میں پارلی منٹ میں پیش ہوئی اور ابھی اس پر بحث باقی ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ریاستی حکومتوں کے پاس بھیجی جائے گی۔ پہلے کمشنر شری بی ملک تھے جنھوں نے جولائی ۱۹۵۷ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک کام کیا۔ دوسرے کمشنر شری اے کے۔ چندا تھے جنھوں نے مارچ ۱۹۶۲ء سے اپریل ۱۹۶۶ء تک یہ ذمہ داری سنبھالی۔ اپریل ۱۹۶۶ء سے اکتوبر ۱۹۶۷ء تک کسی کمشنر کا تقرر نہ ہو سکا۔ اکتوبر سے شری ستی ایم۔ چندر شیکھر یہ کام کر رہے ہیں۔ آٹھویں رپورٹ انھیں کی تیار کی ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ہم اس بات کا اعتراف ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کمشنروں نے اپنے کام میں فرض شناسی، ہمدردی اور دل سوزی کا ثبوت دیا ہے۔ کمشنروں نے اپنے دوروں میں لسانی اقلیتوں کی تمام شکایات پر پوری توجہ کی ہے اور ریاستی حکومتوں کو ان شکایات سے مطلع کیا ہے۔ اگر کمشنر کے پاس کافی اسٹاف ہوتا تو اس کی کارکردگی اور افادیت اور زیادہ ہوتی۔ ہماری رائے میں ہر ریاست میں اس کا ایک نائب ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر ریاست کے مسائل پر اور توجہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہم یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض ریاستی حکومتوں نے نہ تو کمشنروں کو سارے اعداد و شمار مہیا کیے، نہ ان مشوروں پر پوری طرح عمل کیا جو مختلف اوقات میں کمشنروں نے دیے، بلکہ اتر پردیش اور بہار کی حکومتوں نے تو بعض استفسارات کا اب تک جواب نہیں دیا ہے۔ یہ بات بہت نامناسب ہے اور صدر جمہوریہ اور پارلی منٹ کو اس بے نیازی اور بے پروائی پر مناسب باز پرس کرنی چاہیے۔

رپورٹ کے مطالعے سے بعض حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ اتر پردیش کی حکومت نے ۶۵-۱۹۶۴ء کے متعلق صرف ۳۹ ضلعوں کے اعداد و شمار دیے ہیں۔ باقی پندرہ ضلعوں کے متعلق اعداد و شمار وقت پر موصول نہیں ہوئے۔ ان ۳۹ ضلعوں میں اردو اسکولوں کی تعداد ۱۳۶۵، اردو درجوں کی تعداد ۱۵۰ اور طلبہ کی تعداد ۱۰،۱۸،۹۲۰ تھی۔ کہا گیا ہے کہ ان ضلعوں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد پہلے سے کچھ بڑھی ہے مگر جب تک سارے ضلعوں کے اعداد سامنے نہ آئیں پوری ریاست کے متعلق قطعی رائے کیسے قائم کی جائے۔ ہاں کمشنر نے یہ ضرور کہا ہے کہ ریاست میں بیس اردو اسکول کم ضرور ہو گئے ہیں۔

بہار میں جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی اتر پردیش سے کم ہے ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۲،۹۲،۰۱۵ طلبہ اردو میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اتر پردیش میں اردو طلبہ کی تعداد بہر حال اس سے نمایاں طور پر کم ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہار کی حکومت بھی گو اپنے فرائض کی انجام دہی میں چوکس نہیں کہی جا سکتی، مگر اتر پردیش کی حکومت تو اس معاملے میں ایسی مخصوص مثال ہے کہ شاید ملک بھر میں اس کی دوسری مثال نہ مل سکے۔ ان تمام ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دینے والے اسکولوں کی بھی مثال دی جا سکتی ہے۔ مگر نہیں دی جا سکتی تو اتر پردیش میں۔ علی گڑھ کے جن تین اسکولوں کا ذکر آٹھویں رپورٹ

میں کیا گیا ہے وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تحت اسکول ہیں۔ ریاست سے ان اسکولوں کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ آندھرا میں کم ہو کر بھی ۹۶۵،۰۳۵ طلبہ اردو کے ذریعے سے ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میسور میں ۳۸۸،۴۵۴ اور مہاراشٹر میں ۳۸۲،۴۴۴ جبکہ ان ریاستوں کی اردو بولنے والی آبادی اترپردیش کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ثانوی تعلیم کے سلسلے میں تمام ریاستوں کی سوائے مدھیہ پردیش، اترپردیش، بہار اور مہاراشٹر کے، یہ ہدایت ہے کہ اگر پندرہ طالب علم ایک کلاس میں اور ساٹھ ثانوی منزل کے آخری چار سالوں میں مطالبہ کریں تو ان کے لئے ان کی زبانوں میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مگر مہاراشٹر اور بہار میں کچھ ایسے اسکول پہلے سے چلے آ رہے ہیں، اترپردیش اور مدھیہ پردیش میں یہ بھی نہیں۔ اترپردیش کی حکومت کو کمشنر کئی بار توجہ دلا چکا ہے کہ ثانوی تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۶۱ء کی ریاستی وزیروں کی کانفرنس کی سفارشات پر عمل کرے۔ مگر اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اب تک جو سہولتیں لسانی اقلیتوں کو مل رہی تھیں ان کے متعلق مرکز کی ہدایت تھی کہ ان میں کمی نہ ہونے پائے، مگر سوائے مدھیہ پردیش، آندھرا، کیرالا اور مدراس کے کسی ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں مناسب احکام جاری نہیں کئے۔ سہ لسانی فارمولہ کے سلسلے میں بھی، ابھی تک خاصی گڑبڑ چل رہی ہے کمشنر

شاغل عثمانی

طنز و تدبیر

سلامت یہ بزمیں رہیں بدل　　بیٹھے یہ شعر و سخن کا محل
گر قول اردو ہے یہ آج کل　　گیا جنگ اپنا ہی جیتو ڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل*

غزل اور نظم ہو اپنا شعار　　اسی پر ہو علم و ادب کا مدار
تو یوں عرض پرداز ہے خاکسار　　یہی ہے جو حالت تو اے غمگسار
نظر آئے گا جسم اردو کا شل

نہ تعلیم و ترویج پر دھیان ہے　　نہ جائز حقوق ہی کی پہچان ہے
نشاط و طرب کا تو سامان ہے　　کہ بس شعر کہہ لینا آسان ہے
اسی سے تو نکلیں گے قسمت کے بل

ستائے زمانہ تو پرواہ ہے کیا　　ستم پر ستم ہو جفا پر جفا
ہمارا تو ہے اور ہی مدعا　　ملے داد نا فہم صبح و مسا
اسی سے تو سب مسئلے ہوں گے حل

اگر ہے تو تعزیہ سے ہمیں ہے کام　　یہی سعی رہتی ہے اپنی مدام
بہت خوب و بہتر ہے اپنا نظام　　کہ گاتے ہیں ہم بھیروں وقت شام
زباں پر ہے نوحے کے بدلے غزل

بہت ہی موثر ہے اپنا کلام　　کہ داد اس کی دیتے ہیں سب خلق عالم
زباں کے لئے کچھ ہے کتنا حرام　　کہ یہ فرض داری کا ہے اہتمام
وفادار ہو تو اسے دو محل!

چھپے گا کلام اپنا اک دن ضرور　　لکھا ہو گا جس میں مجاز اور بجور
تو اس میں سراسر ہے اپنا قصور　　کہ ہم کو نہیں عاقبت کا شعور
ہلاہل کو سمجھا ہے ہم نے عسل

جو کرنا ہے وہ کام خود کیجئے　　جو دینی ہے امداد وہ دیجئے
یہ کڑوی کسیلی دوا پیجئے　　کوئی ذمہ دار تو سر لیجئے
بھروسہ حکومت پہ طول امل

گرانی عمل کے پیش نظر　　ہوئی یہ نوا تلخ سے تلخ تر
نہ تھا جب صدی خواں کو اس سے مفر**　　تو اس راہ پر چل پڑا بے خطر
رہے تا کہ اردو کا روشن کنول

غرض یہ کہ اردو کی خدمت کرو　　نکل آؤ میدان میں دوستو
یہ کرنی ہے پوری مہم آپ کو　　کسی طرح اس کو نکالو کہ جو
دماغوں میں آیا ہوا ہے خلل

حکومت کے احکام میں صاف تر　　نہیں ہیں یہ ماتحت لیکن اثر
اسی سے ہے اردو زبان پر خطر　　اسی کو سنا ہے المختصر
کرانا ہمیں کو ہے اس پر عمل

* عرفی شیرازی کے اس شعر سے استفادہ کیا گیا ہے
نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی - ۱۲

** خدا کرے اس کا اثر راجستھان کے لئے دانشوروں تک پہنچے۔ اور اکبر الہ آبادی کے اس شعر کا مصداق نہ بننا پڑے۔
میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا　　رہ گئیں سارے حدی خوانوں کی سب تانیں دل

نے لکھا ہے کہ فارمولا میں مادری زبان کا لفظ ضرور آنا چاہئے اور مادری زبان کے معنی صرف دستور کے شیڈول ۸ میں درج زبانیں نہیں لینا چاہئے۔ اترپردیش میں اب بھی یہ صورت حال ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے وہ اردو تیسری زبان کی حیثیت سے بھی پڑھ نہیں پاتے۔ ہاں سنسکرت پڑھتے ہیں۔ اس محرومی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ صدر جمہوریہ اور پارلیمنٹ دونوں کو اس سلسلے میں جلد مناسب ہدایات جاری کرنی چاہئیں۔ (باقی)

صد سالہ جشن غالب کی جھلکیاں

نئی دہلی، مرزا غالب کا صد سالہ جشن منانے کے لئے وزیر اعظم کی صدارت میں کل ہند پیمانہ کی جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے زیر اہتمام غالب کی تمام تخلیقات کے تنقیدی اڈیشن شائع کئے جائیں گے۔ مرزا کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم تیار ہوگی اور اس موقع پر ایک اعلیٰ معیار کے مشاعرہ کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ دہلی انتظامیہ نے عظیم شاعر کی یادگار کے طور پر ایک ہال اور ایک میوزیم بنانے کیلئے آراضی کا ایک وسیع قطعہ کمیٹی کی تحویل میں دے دیا ہے۔ یوپی حکومت سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ آگرہ کے اس مکان کو حاصل کرے جہاں غالب کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی طرح سے اس مکان کو حاصل کرنے کی جہاں مرزا نے اپنی زندگی کا حصہ گزارا تھا، درخواست دہلی انتظامیہ سے کی گئی ہے۔ ان دونوں مکانوں کو قومی یادگار میں بدل دیا جائے گا۔ سرکاری ریلیز کے مطابق کمیٹی نے مختلف یونیورسٹیوں کو لکھا ہے کہ وہ اپنے یہاں "غالب شعبہ" قائم کرکے اس عظیم شاعر کی زندگی اور فن پر تحقیقی کام کا آغاز کریں۔

(قومی آواز)

شریف الحسن لاہرپوری

رسالہ مرقع لکھنؤ

لکھنؤ میں اردو صحافت کی ابتدا ہفتہ وار رسالہ سحر سامری سے ہوئی لیکن یہاں سے کچھ ایسے رسائل بھی نکلے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا۔ ان میں سید مقبول حسین وصل بلگرامی کا رسالہ "مرقع نامی" بھی تھا جو جنوری ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا یہ رسالہ لکھنؤ کے ماہنامہ رسالوں میں امتیازی شان رکھتا ہے اس کے مقاصد میں قدیم و جدید انداز کی باہمی کشاکش کو ختم کرنا اور اصلاح زبان تھا اس کی پالیسی کا لب لباب اعتدال پسندی اور تعصب شکنی تھا رسالہ کے قواعد و ضوابط کے تحت لکھا ہے:

(۱) مرقع ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو دارالادب لکھنؤ سے شائع ہوگا رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک آجانا چاہئے (۲) مرقع کی قیمت عام خریداروں سے پانچ روپیہ سالانہ مع محصول ڈاک اور قیمت زر بقاء دیگر معزز احباب اور اس کے مربیوں سے ان کی ہمت افزائی پر منحصر ہے (۳) مرقع کو موجودہ پالیٹکس یا مذہبی مباحث سے کوئی سروکار نہ ہوگا (۴) تنقیدی مضامین بھی اس میں شائع ہوں گے مگر وہی جن میں خلوص ہوگا باہمی نزاعات یا کسی قسم کے تعصب یا کسی رنج کی بنا پر لکھے ہوئے مضامین سے احتراز کیا جائے گا (۵) مرقع کا مسلک صلح کل ہے وہ انشاء اللہ کبھی دل آزار یا متعصب ثابت نہ ہوگا۔

مرقع کے مربیوں میں عالی جناب مولانا مولوی حاجی سید محمد سبحان اللہ صاحب متخلص بہ عظیم رئیس اعظم گورکھپور، عالیجناب نواب غلام حسین صاحب قمر رئیس اعظم گنیش پور ضلع بستی اور عالیجناب مولانا مولوی سید محمد معصوم علی صاحب نائب ریاست گنیش پور تھے۔

رسالہ کے اجراء اور صلاح و مشورہ میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور ڈاکٹر علامہ اقبال شامل تھے علامہ اقبال نے رسالہ کے سرورق کے لئے اپنے خط مورخہ ۱۸ / نومبر ۱۹۲۵ء میں ایک شعر عطا کیا تھا۔

مخدومی تسلیم

یہ ایک شعر حاضر ہے۔ معلوم نہیں سرورق کے لئے

موزوں ہوگا یا نہیں

ندارد عشق سامانے و لیکن تیشہ دارد

تراشد سینۂ کہسار و پاک از خون پرویز است

مخلص محمد اقبال

اتفاق سے سرورق کے لئے یہ شعر موزوں نہ قرار پایا لہٰذا علامہ نے دوسرا شعر روانہ کیا ہے

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ

عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہ شعر موزوں قرار پایا اور رسالہ کے سرورق پر لکھا جاتا تھا۔

فہرست مضامین کے ورق پر یہ شعر ہوتا ہے

جہاں مرقع تصویر حسن اوست تمام

بہ حیرتم کہ چہ سان دل ازو کہ بردارم

سب سے پہلے عام طور پر غزل ہوتی اس صفحہ پر ابوالعلا حکیم ناطق کا یہ شعر ہوتا ہے

بہ عکس روئے تو ہم رنگ روح انساں است

ز حسن و عشق مرصع مرقع جان است

رسالہ کی ضخامت اڑتالیس صفحات تھی آخر میں آٹھ صفحات ضمیمہ ہوتا تھا جس میں اشتہارات ہوتے تھے مقبول المطابع نظیر آباد لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔

رسالہ کے لکھنے والے لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی، ابوالعلا ناطق لکھنوی، میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں، نیاز فتح پوری اڈیٹر نگار، عبدالماجد دریاآبادی، مولانا عبدالماجد بدایونی، نظم طباطبائی، حمد لکھنوی، مجنوں گورکھپوری، حسام اللہ افسر میرٹھی، فراق گورکھپوری جگت موہن لال رواں، حکیم پریم صفی لکھنوی، ذوقی لکھنوی، سید محمد ہادی صاحب وزیر تعلیم، اصغر گونڈوی، اثر لکھنوی، جگر مرادآبادی جگر بسوانی، پنڈت جگ موہن ناتھ شوق، باسط بسوانی، عزیز بلگرامی، ہوش بلگرامی، شوق بلگرامی، قمر جہاں، بلقیس جہاں، رابعہ خاتون سیونہ غزالی، نذر سجاد صاحبہ۔ اس کے علاوہ نظام حیدرآباد مولانا عبدالحلیم شرر، پریم چند، سدرشن، پروفیسر امانگیان دویدی، شرمتی راما نیرو کے مضامین و افسانے شائع ہوتے رہے نیاز فتحپوری کے بیشتر افسانے مرقع میں شائع ہوئے ان میں کے چند ایسے ہیں جن کو نیاز نے اپنے مجموعہ میں شامل نہیں کیا ہے۔

اصغر گونڈوی کا مجموعہ کلام "نشاط روح" شائع ہوتے ہی اثر لکھنوی نے اس پر تبصرہ کیا اور چند اعتراضات کئے۔ مرقع میں بحث و مباحثہ کا دروازہ کھل گیا صفدر مرزاپوری نے شرر کی حمایت سے اثر لکھنوی پر اعتراضات کئے۔ وصل بلگرامی نے سمجھوتہ کرادیا ورنہ شاید شرر لکھنوی کی ہنگامہ پسند طبیعت ایک اور ادبی معرکہ کو جنم دیتی۔

اہل لکھنؤ نے زندہ دلان پنجاب کو اہل زبان نہیں سمجھا لکھنؤ کے شعراء اپنا کلام پنجاب کے رسائل میں شائع نہیں کراتے تھے لکھنؤ والوں نے علامہ اقبال پر بھی اعتراض کئے ہیں لکھنؤ میں اقبال کی وہ قدر نہیں ہوگی جس کے وہ مستحق تھے۔ مرقع جولائی ۱۹۳۰ء میں خواجہ شمس الدین احمد صاحب کا مضمون "اقبال کی اردو" شائع ہوا ہے وہ رقمطراز ہیں:

"اقبال کی اردو دانی میں بہت لوگوں کو کلام ہے، ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ پنجابی ہیں لکھنؤ یا دلی کے باشندہ نہیں اور ان شہروں میں ان کو بود و باش کا اتفاق ہوا ہے اس لئے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ شرفائے لکھنؤ یا دلی کے برابر زبان داں ہوں گے غلطی ہے۔ ان کی بانگ درا میں جو لغزشیں ہیں وہ زیادہ تر محاورہ کی ہیں اور بعض تذکیر و تانیث کی بھی ہیں مثلاً چند بیان کی جاتی ہیں ؎

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر

کسی کے سر باندھنا نہیں کہتے، بلکہ سر پر باندھنا محاورہ ہے اور دل میں باندھنا یا سر منڈھنا بھی بولتے ہیں مگر اس سے دوسرے معنی پیدا ہو جاتے ہیں کہتے ہیں کہ فلاں تو فلاں چیز تم نے میرے سر باندھی یا منڈھ دی یعنی زبردستی کی۔

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں

کسی کو پیار کرنا بولتے ہیں کسی سے پیار کرنا محاورہ نہیں ہے البتہ پیار اور اخلاص ساتھ کہیں تو بولیں گے آج کل ان سے آپ کا پیار اور اخلاص بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر جہاں خالی پیار کا لفظ ہے بچنا چاہئے۔"

مرقع کی یہ بھی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے سب سے پہلے اکثر اساتذہ، مشاہیر شعرا اور ادبا کے خطوط کے عکسی نمونے شایع کئے۔ ان عکسی تحریروں کے متعلق ملا رموزی نے اعتراض بھی کیا تھا اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی تحریریں شایع ہو گئی ہیں جن کا شمار مشاہیر میں نہیں ہے۔ مرقع کے مارچ ۱۹۲۷ء میں غالب کی تحریر کا ایک عکس ہے۔ اس خط کے بارے میں وصل بلگرامی نے نوٹ لکھا ہے کہ یہ خط مولوی ابو الحسن صاحب ابن جناب مولانا عبد الحق حقانی دہلوی مرحوم نے مجھے عنایت فرمایا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ خط کس کے نام ہے اور اس میں جس رباعی کا ذکر ہے وہ رباعی بھی نہ مل سکی بہر حال یہ تحریر حضرت غالب مرحوم کے قلم کی ہے جو ایک یادگار چیز ہے۔ اب خط ملاحظہ ہو۔

"بندہ پرور! آج میں نے دو انگریزی عرض روانہ کردی اور صبح کو آپ کا کاغذ مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام مجھ کو دے گیا۔ اس عنایت کا شکریہ کیا خدمت بجا لاؤں، بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیں۔

امید بہ تشدید میم و تخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے ایسا نہ ہو کہ جناب ممدوح اس کو زحاف کہیں پہلے اور دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدد ہے۔"

امید ہے غالبیات سے دلچسپی لینے والے حضرات اس خط کے متعلق مزید روشنی ڈالیں گے۔

جنوری ۱۹۲۷ء کا رسالہ افسانہ نمبر ہے۔ افسانہ نمبر کے متعلق وصل بلگرامی لکھتے ہیں:

"اس میں اگر ایک طرف آپ نیاز، مجنوں، احسن، اختر، جلیل، نذر سجاد حیدر ایسے مسلمان مسلم الثبوت اور نامور افسانہ نگاروں کے شاہکار ملاحظہ فرمائیں گے تو دوسری جانب انہیں کے دوش بدوش پریم چند، سدرشن، ردال، فراق، برق، آمادیوی ایسے مستند اور مشہور ہندو افسانہ نویسوں کی سحر طرازیوں کے نقوش بھی پائیں گے۔ مرقع کے صلح کل، غیر ملک آزار، غیر متعصب (اور اتفاق و اتحاد کے حامی) ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔"

اس افسانہ نمبر میں افسانوں کے علاوہ افسانوں سے متعلق دو مضامین ہیں ایک جناب اشہر لکھنوی کا "افسانے کی اہمیت" اور دوسرا جناب بشیر احمد علوی کا "افسانہ کیا ہے"۔ دونوں مضمون اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں اور معلومات افسانہ کا ایک اچھا خاصہ آئینہ ہیں۔ اس نمبر میں سب سے مختصر افسانہ حامد اللہ افسر میرٹھی کا "دوا کی قیمت" ہے۔ یہ امریکن افسانہ نگار کے افسانہ سے ماخوذ ہے جو امریکہ میں ۱۹۲۲ء کا بہترین افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

مرقع میں ۱۹۲۸ء سے افسانوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تھی۔ یہ رسالہ کب تک جاری رہا یہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اس کی ۱۹۲۹ء تک کی مکمل فائلیں حاصل ہوئی ہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف پر تنقید یا محاکمہ جتنا آسان ہے اردو نثر اور نثر نگاروں کا مطالعہ اور تجزیہ اتنا ہی دشوار ہے۔ یوں تو اردو نثر پچھلے سو سال کے عرصے میں بہت سی ارتقائی منزلیں طے کر چکی ہے مگر نثری تحریروں اور ان کے مصنفوں کی ادبیت اور ان کا معیار متعین کرنے میں خاصی دقتیں ہیں۔ زمانۂ حال کے ایک ذہین نقاد کو یہ شکایت ہے کہ اب اردو میں مختلف موضوعات پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کی نثر اپنی ساخت اور اسلوب کے اعتبار سے اردو کی پہلی کتاب والی نثر ہے۔ دوسری طرف بعض لکھنے والے ایسے بھی ہیں جنھیں یہ دعویٰ ہے کہ وہ فلسفہ، تاریخ، تحقیق یا تنقید جیسے موضوعات پر بھی ٹکسالی زبان یا محاوراتی اسلوب میں لکھ سکتے ہیں یا ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ علمی اور سائنسی موضوعات بھی انشائے لطیف کے پیمانے میں ڈھل جائیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی ہمارے یہاں ادبی اور غیر ادبی نثر کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی ہمارے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ طرز یا اسلوب کسے کہتے ہیں اور یہ کہ آیا ہر نثر لکھنے والے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ صاحب طرز یا صاحب اسلوب نثر نگار ہو۔

میرا خیال یہ ہے کہ انشا یا اسلوب کا تعلق صرف اصل تخلیقی تحریر سے ہے۔ تخلیقی تحریر کے لئے مصنف کی شخصیت کا تخلیقی ہونا ضروری ہے۔ ادب، فن یا تخلیق ابلاغ محض یا صنعت گری دونوں سے الگ ایک چیز ہے۔ ہماری پرانی کتابوں میں تخلیقی نثر یا اسلوب کے متعلق کوئی ایسا اصول نہیں ملتا جس سے اسلوب اور صاحب اسلوب کی شخصیت کے اندرونی ربط کو تلاش کرکے اس طرح کے حدود متعین کیے جا سکیں۔ کچھ لوگوں نے نثر کو نثر مرجز، نثر مقفیٰ، نثر مسجع اور نثر عاری میں تقسیم کیا۔ بحر الفصاحت کے مولف نے سلیس سادہ، سلیس رنگین، دقیق سادہ، دقیق رنگین قسم کی اصطلاحات کی مدد سے ان کی گروہ بندی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے اس قسم کی گروہ بندی سے ہمارے یہاں یہ تصور رائج ہوگیا کہ ادبیت کوئی ایسی چیز ہے جو تحریر پر اوپر سے عائد کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے رقعے یا [illegible]، نامے سے لے کر نو طرز مرصع اور فسانۂ عجائب جیسی داستانیں بیان کرنے یا روضۂ تاج گنج کی تعریف میں مضمون لکھنے کے لئے ان منتروں پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ تحریر میں ادبیت پیدا کرنے کی ضامن ہیں۔

جس طرح شاعری کی اصناف کے اوپری ڈھانچے کو برتنے والا یعنی ردیف و قافیہ اور عروض کے جملہ شرائط کو پورا کرنے والا حقیقی شاعر نہیں بن جاتا بلکہ شاعری محض کلام موزوں سے آگے کی چیز ہے اسی طرح نثر کے کسی پیرائے کو اوپری طور سے برت کر ادبی نثر کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ فن کسی علم، اطلاع یا واقعہ کو بیان کرنے سے آگے کی چیز ہے یہ بیان اگر اوپر سے رنگین بنا دیا جائے یا اس پر کچھ مرصع کاری کر دی جائے تو تحریر پر ادبی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے مگر در اصل وہ ادبی یا تخلیقی ہوتی نہیں ہے۔ فن یا تخلیقی تحریر لکھنے والے کے تجربے، علم، خیالات اس کی داخلی شخصیت اور اس کے لطیف احساسات کے امتزاج اور کیمیاوی عمل سے وجود میں آتی ہے۔ خارجی علم یا تجربے اور مصنف کی داخلی شخصیت کا یہ امتزاج جتنا بھرپور اور مکمل ہوگا فنی تخلیق اتنی ہی پختہ اور کامیاب ہوگی۔ اچھے فنکار کے یہاں بھی یہ امتزاج ہمیشہ نہیں ہوتا اسی اعتبار سے اس کی تحریر کے مدارج قائم کیے جا سکتے ہیں اور ان میں بلند و پست اور ادبیت و غیر ادبیت کی حدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

ابرار اعظمی

غزل

عین ممکن ہے دوا درد کی خالی جائے
کیوں نہ میخانے سے وہ چیز نکالی جائے

خود پسندی تری تسکین انا کی خاطر
ایک تصویر خیالی ہی بنالی جائے

شہر تنہائی میں سایہ بھی مرے ساتھ نہیں
خود کو بہلانے کی کیا شکل نکالی جائے

لوگ بازار میں ایمان لئے بیٹھے ہیں
آج کوئی بھی خریدار نہ خالی جائے

اب نکلتا نہیں سورج بھی تاریکی کو
اب شب و روز کی یہ قید اٹھالی جائے

غیر ادبی یا غیر تخلیقی نثر لکھنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے اور نہ کسی زبان کی اہمیت اس بات پر منحصر ہے کہ اس کا سارا نثری سرمایہ ادبی نثر پر مشتمل ہو اور اس کے سب نثر نگار ادیب یا صاحب طرز نثر نگار ہوں۔ علمی اور سائنسی نثر کی اہمیت اور افادیت خود اپنی جگہ پر ہے بلکہ اس کے بغیر کوئی زبان وقیع نہیں کہی جا سکتی۔ ہر زبان میں ہزاروں کتابیں تاریخ، فلسفہ، نفسیات، معاشیات، سماجیات، سائنس، طب، فن تعمیر اور دوسرے علوم سے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ ان کے لکھنے والوں کو اس بات کی فکر بھی نہیں ہوتی کہ ان کتابوں کو ادبیات کے دائرے میں لایا جائے یا ان کے لکھنے والوں کو ادب کی تاریخ میں بحیثیت ادیب کے جگہ ملے۔ مگر اس کے باوجود ان کے مصنف عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سرسید جن کو اردو نثر کا معمار کہنا بالکل صحیح ہے یہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی نثر کو خالص ادبیات کے دائرے سے نکال کر وسعت دیں اور علمی، کاروباری اور عمومی نثر کی افادیت کو بھی عام کریں۔ خود ان کے یہاں دونوں طرح کی نثر کے نمونے مل جاتے ہیں خالص ادبی اور تخلیقی بھی اور خالص علمی اور سائنسی بھی۔ مولوی چراغ علی، محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، عبدالرزاق کانپوری، اور اس طرح کے لکھنے والوں کی میری نظر میں بڑی وقعت ہے کہ انھوں نے اس علمی نثر کے فروغ میں بیش از بیش حصہ لیا مگر بیسویں صدی میں نثری ادب کے تنقیدی اصول وضع نہ ہونے سے بعض غلط فہمیاں رائج ہو گئی ہیں جن کے نتیجے میں ایک طرح کی غیر فطری نثر سے ہمیں اکثر سابقہ پڑتا ہے۔ یہ غیر فطری نثر اس وقت وجود میں آتی ہے جب غیر تخلیقی شخصیت رکھنے والا کسی علم، اطلاع یا کسی اور مواد کو خارجی طور پر حاصل کر کے اسے اپنی شخصیت اور اپنے تخلیقی تجربے سے ہم آہنگ کئے بغیر محض ادبی نثر لکھنے کے لالچ میں اوپر سے رنگ آمیزی کرتا ہے اور محاورات، تشبیہات و استعارات یا تراکیب کی دوکان سجاتا ہے۔ نثر میں شاعرانہ ٹکڑے جوڑتا اور رعایت لفظی کے جوہر دکھاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس طرح کا لکھنے والا اپنے آپ کو صاحب طرز ادیب سمجھتا ہے اور اپنی نثر کے مقابلے میں حالی، پریم چند یا عبدالحق کی تحریروں پر ترحم کی نظر ڈالتا ہے۔

میرے خیال میں نثر کی ادبیت کا تعلق نہ تو سادگی سے ہے اور نہ رنگینی سے کیونکہ یہ ادبیت کسی میکانکی عمل یا صنعت گری سے نہیں بلکہ تخلیقی عمل سے وجود میں آتی ہے۔ غیر تخلیقی ذہن خواہ سادہ پیرایہ اختیار کرے خواہ رنگینی کا جامہ پہنے ہر حال میں غیر تخلیقی چیز ہی اس سے برآمد ہوگی۔ شخصیت اگر تخلیقی ہے تو میرامن، غالب، حالی اور پریم چند بھی اسی طرح ادبی نثر نگار ہیں جس طرح سرشار، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد اور اس طرح کے لکھنے والے۔

جس طرح ایک غیر حقیقی اور جعلی شاعر کو ہم متشاعر کہتے ہیں اسی طرح اس نوع کے نثر نگاروں کے لئے میں کسی اصطلاح کے وضع کرنے کی فکر میں ہوں۔ میرے نزدیک علمی، سائنسی، کاروباری اور عمومی نثر لکھنے والوں کی بڑی اہمیت ہے اور میں ہر زبان کے لئے اخبار نویسوں اور مترجموں کو بھی ضروری اور مفید خیال کرتا ہوں لیکن ادبی نثر کے بھیس میں غیر فطری اور پر تصنع نثر اور جعلی اسلوب کو رائج کرنے والوں کو میں نثر کے حق میں ایک مستقل خطرہ سمجھتا ہوں۔ ضرورت ہوئی تو اس موضوع پر کبھی اور کھل کر باتیں ہوں گی۔

کتابیں ملیں

امیر خسرو
مصنف:- علی عباس حسینی
ناشر:- پنجابی پستک بھنڈار، دہلی
صفحات:- ۱۶۲ قیمت:- تین روپے پچھتر پیسے

سحر دراج آدم (مجموعۂ نظم)
مصنف:- رفعت سروش
ناشر:- مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی
صفحات:- ۱۶۲ قیمت:- پانچ روپے

تلاش و توازن
مصنف:- ڈاکٹر قمر رئیس
ناشر:- خرام پبلیکیشنز، دہلی
صفحات:- ۲۵۲ قیمت:- ۶/۰۰

نیا طبقہ
مترجم:- جلیس عابدی
ناشر:- نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ دہلی
صفحات:- ۱۰۴ قیمت:- ایک روپیہ

مخدوم ایک مطالعہ
مصنف:- داؤد اشرف
ناشر:- انجمن تحفظ اردو، آندھرا پردیش
صفحات:- ۱۵۲ قیمت:- ۲/۵۰

انیس انور

مکتوب لندن

اردو اقتباسات

پنجشنبہ کی شب میں نشر ہونے والے بی بی سی کے پروگرام میں پہلی بار اردو میں شائع شدہ دو اقتباسات پیش کئے گئے۔ اس پروگرام کا عنوان ہے "اخبارات کیا کہتے ہیں" یہ پروگرام گزشتہ چھ سات سال سے نشر ہو رہا ہے اردو اقتباسات "برمنگھم پوسٹ" اور "یارکشائر پوسٹ" سے لئے گئے تھے۔ یہ دونوں اخبارات ہفتہ میں ایک مرتبہ اردو داں قارئین کے لئے اردو میں ایک کالم شائع کرتے ہیں اور ان اقتباسات کا تعلق مسٹر پاول کی تقریر سے تھا۔ مائیکل پارکنسن نے اردو میں شائع شدہ اقتباسات پیش کرنے کی قابل تقلید روایت قائم کی ہے۔ امید ہے وہ اسے مزید جاری رکھیں گے اور بہتر بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔

شعبۂ علوم فارسی، مانچسٹر یونیورسٹی

۳۰ اپریل کو پروفیسر بوائل، مانچسٹر یونیورسٹی نے پاکستانی ڈپٹی ہائی کمشنر برائے لندن جناب اخلاق اقبال کو یونیورسٹی کے شعبۂ علوم فارسی میں مولانا جلال الدین رومی کی حیات اور فکر و فن پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا۔ معزز مہمان نے اس موقع پر مولانائے روم کی زندگی اور شاعرانہ تخلیقات پر اپنے خیالات کا موثر اظہار کیا۔ آپ نے کہا کہ مولانا جلال الدین رومی نے تیرھویں صدی میں ترکی کے شہر قونیہ میں حضرت شمس تبریز سے نیاز حاصل کیا۔ اور ان کی شخصیت اور بزرگی سے حصول فیض کیا۔ آپ نے پچاس ہزار اشعار میں اپنے مرشد کو بار بار خراج عقیدت پیش کیا۔ اپنی شاعرانہ تخلیقات میں مولانا نے عقل کے مادی تجزیہ کی بجائے عشق کے کیف و مستی سے بھرپور لمحات میں مسائل کائنات کا حل تلاش کیا ہے۔ آپ کی شاعری میں زندگی کا ہر لمحہ تخلیق کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے موصوف نے مزید کہا کہ آج کے مشینی دور میں فکر، مادی روپ دھار رہی ہے۔ سائنس نے ہمیں مشینیں دے کر ہمارا اطمینان و سکون چھین لیا ہے اور اس مادہ پرست دور میں مولانائے روم کا کلام ہمیں جہاں گم کردہ اطمینان قلب واپس دلا سکتا ہے۔

از۔ انیس انور

روز حساب

دیار غرب میں رکھا ہے ظلمتوں نے قدم
سیاہ شام میں اب صاحبان سیف و قلم
حصول زر کا رہا ہے جو سلسلہ پیہم
حساب مانگنے آئے ہیں کشتگان ستم
یہ مال خام کے انبار کارخانوں میں!
یہ کس کے فن کی نمائش نگارخانوں میں!
نظر فریب ہیں قالین بھی مکانوں میں!
یہ جنس غیر چمکتی ہوئی دکانوں میں!
ہیں برف خانے میں اشیائے خوردنی وافر
ہیں درسگاہوں میں غیروں کے علم و فن پر
شراب خانے میں رقصاں ہیں ساقی و ساغر
فروخت ہوتے ہیں اجسام مرمریں اکثر
بکے ہوئے ہیں سب اوقات نفس کو فرصت
چکا دو دام تو ہر فرد پیش خدمت ہے
کہ تاجرانہ ذہن و تعقل قدر و قیمت ہے
سنبھل کے بات کرو زبان بھی تجارت ہے
عروج مہر حکومت زوال آمادہ
شمال صنعت و حرفت زوال آمادہ
نظام بزم سیاست زوال آمادہ
وہ اجتہاد و روایت زوال آمادہ
کنواری ماؤں کو رو بیٹھی ہے کنواری ماں
منشیات کے طالب کئی ہیں پیر و جوان
خلاف وضع کو آئین کی ملی ہے اماں
قمار خانوں میں نادار کی ہوس عریاں
خبر دو ہوش کی روز حساب آ پہنچا
تمہارے حیلہ و فن کا جواب آ پہنچا
سنبھل کے عیش زمانہ خراب آ پہنچا
کہ سیف عشرت پہ آب شتاب آ پہنچا
تمام نیک و بد اعمال یاد کر لینا
شمار جور جفا و ملال یاد کر لینا
مسیح پاک کے اقوال یاد کر لینا
جواب پرسش اعمال یاد کر لینا

مراسلات

غالب نگر

ہندوستان کو بہ استثنائے اجمیر شریف اگر کسی شہر پر فخر ہے تو وہ آگرہ ہے، جہاں کا تعمیری شاہکار تاج محل اپنی جگہ لاجواب ہے اور جہاں غالب جیسا انتخاب روزگار پیدا ہوا۔ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کی صد سالہ تقاریب کی کمیٹی نے حال ہی میں صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ آگرہ فورٹ یا آگرہ کے کسی دوسرے اسٹیشن کو غالب نگر کے نام سے موسوم کیا جائے۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل امریکی اور برطانوی سیاحوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی غرض سے یہ تجویز روبہ عمل لائی گئی تھی کہ آگرہ میں کسی جدید ہوٹل میں تاج محل کے نوادرات اور مصنوعات کی نمائش کی جائے، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ آگرہ میں غالب کی تصانیف اور ان کے مرقع جات کی نمائش کی جائے اور اسے مستقلاً قائم کیا جائے تاکہ نسلاً بعد نسل غالب کو خود ان کی پیشین گوئی کے بموجب ؎

"کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

خراج عقیدت ملتا رہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے سچ کہا تھا کہ

"ہندوستان کو دو مقدس ورثے حاصل ہوئے ہیں
ایک مقدس وید اور دوسرا کلام غالب"

کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ جس مکان میں غالب کی پیدائش ہوئی تھی اس کو غالب کمیٹی کے حوالے کیا جائے لیکن اس تجویز میں اضافے کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ وہ یہ کہ یورپ میں جس طرح مشہور عالم موسیقار MOZART کے لئے SALZBURG, VIENNA میں اس کی پیدائش گاہ کے لئے MOZART MUSEUM قائم کیا گیا اور اس عمارت کے دروازے پر MOZART'S GEBURTSHAUS کی تختی لگی ہوئی ہے۔ اس پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں میں تصاویر کے ساتھ اس کو انتہائی اشاعت کا ذریعہ بھی بنایا گیا ہے۔

اسی طرح آگرہ میں غالب کی نمائش گاہ میں آگرے کا وہ مکان بھی شامل کر لیا جائے جہاں غالب کی پیدائش ہوئی تھی تو نامناسب نہ ہوگا۔ ورنہ امتداد زمانہ کے اثرات اور لسانی اور سیاسی آویزشوں کی وجہ سے خطرہ ہے کہ غالب کا پیدائشی مکان کہیں غالب کے اس مصرعہ کے حسب حال نہ ہو جائے کہ

"دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں"　(سید وقار حسین)

استفسار

مجھے ایک فارسی نظم جس کا عنوان غالباً "تیر و عقاب" ہے کی ضرورت ہے۔ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عقاب، اپنی نظر، اپنی اڑان اور اپنی طاقت پر غرور کر رہا تھا کہ اتنے میں اس کے ایک تیر آ لگا۔ اس تیر کا پچھلا حصہ اس کے پروں سے ملتا جلتا تھا۔ اس سے عقاب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "از ماست کہ بر ماست"۔ اس نظم میں یہ شعر بھی آیا ہے۔

اینش عجب آمد کہ ز چوبی و ز آہن
ایں تندی و تیزی و پریدن ز کجا خاست

آگے آخری مصرعہ میں "از ماست کہ بر ماست" بھی آیا ہے۔

کسی صاحب کو یہ نظم یاد ہو تو از راہ کرم "ہماری زبان" کے صفحات کے ذریعہ بقید شاعر اور ممکن ہو تو اس کے عہد کی وضاحت کے ساتھ مطلع فرمائیں، اکرم ہوگا۔

(سید مبارز الدین رفعت)

فتح محمد جالندھری کے حالات زندگی

مجھے مشہور ماہر گرامر مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے حالات زندگی کی ضرورت ہے۔ مجھے ان کی تاریخ پیدائش و وفات، تصانیف کی فہرست اور خاندانی حالات مطلوب ہیں۔ "ہماری زبان" کے خریداروں سے اس سلسلے میں تعاون کی درخواست ہے۔　(حمیرا)

انجمن ترقی اردو اجمیر کا انتخاب

اجمیر۔ بتاریخ ۱۵ مئی ۶۸ء بوقت ساڑھے پانچ بجے شام دفتر انجمن ترقی اردو اجمیر میں ایجنڈے کے مطابق مجلس عاملہ کا جلسہ انتخاب زیر صدارت جناب سید عبدالرؤف منعقد ہوا۔ اور مندرجہ ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

جناب سید عبدالرؤف صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر صدر
جناب ہردے نرائن سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ نائب صدر
جناب حمید خان صاحب ریٹائرڈ آبکاری سپرنٹنڈنٹ نائب صدر
جناب قاضی سید حفیظ علی صاحب اطہر صدیقی سکریٹری
جناب احتشام اختر صاحب جوائنٹ سکریٹری
جناب ڈاکٹر عبدالمنان صاحب راہی جوائنٹ سکریٹری
جناب رام لال صاحب ندیم اسسٹنٹ سکریٹری
جناب مولوی اقبال حسن صاحب خزانچی (سکریٹری)

انجمن ترقی اردو بنگال کی طرف سے پرویز شاہدی کو خراج عقیدت

کلکتہ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۳ مئی سات بجے شام کو ہوا جس کی صدارت صدر انجمن ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونی ورسٹی نے فرمائی۔ یہ جلسہ پرویز شاہدی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا جس میں سینٹ ایم اوہائی اسکول کے دو طلبہ محمد نعیم اختر میرزا افتخار حسین صدر اردو کلب ... اور شعرا میں جناب رضا مظہری، جناب سالک لکھنوی۔ جناب احمد اللہ اصغر بہار ترکی اور رئیس الدین فریدی نے پرویز صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اس عظیم شاعر کی ایک مناسب یادگار قائم کرنے پر زور دیا۔ صدر ریاستی انجمن ترقی اردو بہار جناب غلام سرور ایڈیٹر "سنگم" پٹنہ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ پرویز صاحب کی مستقل یادگار قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ریاستی انجمن ترقی اردو بہار اور بہار کے عوام کے پورے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

جناب برق انصاری، جناب مظفر حیدری، جناب ادریس احمد دوراں، جناب ریاض غازی پوری اور جناب رضا مظہری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

محمد شہاب الدین نے پرویز صاحب کی ایک غزل اور علقمہ شبلی نے ان کی آخری غزل سنائی۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل قرار دادیں پیش کی گئیں اور حاضرین جلسہ نے دو منٹ خاموش کھڑے رہ کر سوگ منایا۔

پہلی قرارداد میں پرویز صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی وفات کو اردو زبان و ادب کے لیے ایک سانحہ عظیم تصور کیا گیا ہے۔ اور انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان اور وابستگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی ہے

اس تعزیتی قرارداد کے علاوہ یہ تجویزیں بھی منظور ہوئیں کہ کلکتہ یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کو علیحدہ حیثیت دی جائے نیز "بس ریخ" کا نام بدل کر "پرویز شاہدی ریخ" کر دیا جائے۔ ان کی ایک مناسب یادگار قائم کی جائے جس کی تفصیلات انجمن طے کرے گی۔ نیز یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ انجمن دوسری ادبی انجمنوں کے اشتراک سے ایک بڑا مرکزی اور مشترکہ تعزیتی جلسہ کرے جس میں نہ صرف اردو بلکہ بنگلہ، ہندی اور انگریزی کے ادبا و شعرا اور دوسرے لوگ بھی شریک ہوں اس جلسے میں پیش کیے گئے تاثرات کو دوسرے مضامین کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

(علقمہ شبلی اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کلکتہ)

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا توسیعی خطبہ

دہلی ۴ مئی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری صدر شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ۱۳ مارچ سن ۱۹۶۸ء کو ٹیوٹوریل بلڈنگ ایکسٹنشن میں ادبی اقدار کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا۔ صدارت کے فرائض پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی نے انجام دیے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ادبی اقدار پر بحث کرتے ہوئے ان مختلف عوامل اور محرکات پر روشنی ڈالی جن سے کسی دور کی ادبی اقدار وجود میں آتی ہیں انھوں نے کہا کہ دراصل ادب اور زندگی میں ایک زیر زمین رشتہ ہے ادب روز کی صورت حال اور رویے کی گرد وجود میں آتا ہے بڑا ادب عصری مسائل سے دست و گریبان ہونے سے پیدا ہوتا ہے اور اس عمل میں وہ اپنے عصر ماورا ہو جاتا ہے انھوں نے فرمایا کہ ادبی اقدار یکسر انسانی بھی ہیں اور ابدی بھی۔ اور فن کار جس حسن کی تشکیل کرتا ہے وہ بدصورتی سے بھی عبارت ہوتا ہے علاوہ حسن کاری میں بدصورتی اور کریہہ عناصر کو بھی فن کار خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ فن کا صحیح عرفان داخلیت اور خارجیت تعلیم اور تحسین کے توازن سے پیدا ہوتا ہے اور اس لیے آرٹ کی بنیادی قدر مرکزیت اور ہم آہنگی CENTRALITY AND INTEGRATION کو قرار دیا جا سکتا اصناف ادب میں اور نثر میں بھی یہ قوت بھرپور طریقے پر ظاہر ہوگی اس پر تو ہے دوسرا ان پر قابو رکھتا ہے۔ توسیعی خطبے کے بعد ڈاکٹر محمد حسن نے معزز مقرر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی)

جدیدیت پسندی اور اردو ادب میں ترقی پسند میلانات پر مذاکرہ

علی گڑھ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کی ادبی انجمن "سنگم" کی جانب سے "جدیدیت پسندی اور اردو میں ترقی پسند رجحانات" پر ایک سیمینار ۱۶ اور ۱۷ مارچ کو منعقد ہوا جس میں مقامی ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر محمد عقیل، صدیق الرحمان قدوائی اور شریف احمد صاحب نے شرکت کی۔ افتتاحیہ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کی۔ سیمینار کا افتتاح ڈاکٹر عبد العلیم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے ادیب کی سماجی ذمہ داریوں پر زور دیا اور کہا: "ادیب کو سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے قلم اور خیالات سے کس قسم کی دنیا پیدا کرنا چاہتا ہے اور اپنے سماج اور فرد کو کس سمت میں لے جانے کا خواہش مند ہے" انھوں نے مزید کہا۔ "فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ سماجی عمل ادب کا ہے اور اسی لیے اس کا ذریعہ زبان ہے جو خود سماجی عمل کی مرہون منت ہے۔ اس لئے تجریدی مصوری تو شاید ممکن ہے مگر ان معنوں میں تجریدی زبان اور ادب ممکن نہیں جو صرف مصنف کے لیے ہو اور کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ ترقی پسندی کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر علیم نے کہا کہ ترقی پسندی کسی فیشن یا نعرے کا نام نہیں۔ وہ کوئی بندھا ٹکا نقطۂ نظر بھی نہیں بلکہ وہ انسانی تعلقات، فکر اور جذبے کی، افراد اور معاشرے کی کشمکش اور ہم آہنگی کی خواہش کے حقیقت پسندانہ اظہار سے عبارت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس کشمکش کی عکاسی تو ہو مگر ادبی اور شعری تقاضے پورے نہ ہوں اس صورت میں فن کار گویا اپنے منصب کو پورا نہیں کر سکے گا۔ ترقی پسند ادیبوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھیں ادبی اور شعری حسن کو ملحوظ رکھیں اور اعلیٰ فنی قدروں کو اپنائیں۔

جدیدیت کے بعض گروہ کی متعلقین کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جو لوگ ادب کی سماجی ذمہ داری سے انکار کرتے ہیں وہ روٹی، روزی اور سماجی منصب کے حصول کے لئے عام انسانوں کے سے تمام گر استعمال کرتے ہیں لیکن ادب میں اپنے کو عام انسان سے اور سماج سے الگ تھلگ اور غیر متعلق ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیا سماج کو اس کا حق نہیں کہ وہ بھی اپنے کو غیر متعلق قرار دے سکے آپ نے مزید فرمایا کہ جو ادب کسی کی سمجھ میں نہ آئے یا ترسیل سے بے پروائی برتے میں اسے سماج دشمن سمجھتا ہوں۔ نئی بات کہنے کی خواہش بہت مبارک ہے لیکن اس کوشش میں بھی ادب کے بنیادی منصب کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر علیم کی تقریر کے بعد کنور پال سنگھ نے اپنی مختصر تقریر میں سیمینار کا مقصد بیان کیا اور کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اردو اور ہندی میں نئے ترقی پسند رجحانات کا جائزہ لیا جائے اور ان پر کھل کر بحث کی جائے۔

سید سجاد ظہیر صاحب نے اپنے مقالے میں شاعری میں فنون لطیفہ کے آغاز اور اس کے سماجی ارتقا پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا "ترقی پسند تحریک ادبی سطح پر استحصال پسندی، بیگانگی اور اجتماعیت دشمن رجحانات کے خلاف جدوجہد کرتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض اشخاص کی غلطیوں یا ہماری تنظیمی کمزوریوں کو دلیل بنا کر اس جدوجہد کو مطعون کیا جا رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے میں ان کمزوریوں اور غلطیوں کے لئے معافی مانگنے پر تیار ہوں بشرطیکہ اس کی ضرورت محسوس کی جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جدوجہد آج نہ صرف جاری ہے بلکہ ضروری اور ناگزیر بھی ہے۔"

سجاد ظہیر صاحب کے بعد ڈاکٹر نامور سنگھ نے جلسہ کو خطاب کیا اور کہا کہ ترقی پسندی کے مفہوم پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یورپ میں ترقی پسند اور مارکسی نقادوں کے مختلف میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے لوکاچ، کاڈویل، فاکس اور دوسرے دانشوروں کے خیالات کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ آج کے حالات میں ترقی پسندی ہی نہیں مارکس ازم کا بھی سخت گیر تصور ممکن نہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنا مقالہ "نئی جدیدیت نئی ترقی پسندی" پڑھا۔ اور کہا کہ جدیدیت کے نام سے جو رجحان سامنے آ رہا ہے وہ صرف ایک گروہ سے عبارت نہیں بلکہ اس میں کئی گروہ شامل ہیں۔ ایک بے چینی کو جو قدیم اقدار کے ٹوٹنے اور نئے صنعتی شکنجے سے پیدا شدہ پابندیوں سے پیدا ہوئی ہے عقل دشمن اور سماج دشمن فلسفوں کے رنگ میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جدیدیت پسندوں میں بھی ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو صورت حال میں تبدیلی کا خواہاں ہے مگر تبدیلی کی سمت اور اس کے ذریعہ کا تعین نہیں کر پاتا۔ گویا وہ ارباب اقتدار کا آلۂ کار بننے کو تیار نہیں ہے اور اسی لئے مبہم اشاریت، مایوسی اور تنہائی میں پناہ لینا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر عرفان حبیب نے سماجی علوم میں مارکسی مطالعے کے مسائل پر مقالہ پڑھا اور بتایا کہ مختلف مورخین نے کس طرح ہندوستانی تاریخ کو طبقہ داری اور جدلیاتی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے فرمایا کہ پچھلے دو تین سال میں برابر ترقی پسند مصنفین کے قیام کی ضرورت پر گفتگو ہوتی رہی ہے میرا یہ خیال تھا کہ مصنفین کے لئے ترقی پسندی کی صفت لگانا یا ان کو انجمن کی شکل میں منظم کرنا غیر ضروری ہے۔ مگر مجھے سال بھر سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ موجودہ حالات میں نہ صرف تنظیم کی ضرورت ہے بلکہ نئے سرے سے ترقی پسندی کے مفہوم کی وضاحت بھی ضروری ہے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے

کہا کہ جدید ہونا اچھا ہے مگر صرف جدید ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ آدمی کو تھوڑا سا قدیم بھی ہونا چاہیے۔

(دوسرا جلسہ) دوسرا جلسہ ۲۰ مارچ کو صبح دس بجے شروع ہوا جلسہ کا آغاز ڈاکٹر قاضی عبدالستار کے مقالے سے ہوا جس میں انھوں نے کہا سماجی حقیقت نگاری کا لفظ اکثر ترقی پسند نقادوں نے اپنے عہد کی نمائندہ حقیقت کو اپنے نمائندہ کرداروں کے ذریعہ پیش کرنے کے لئے استعمال کیا ہے لیکن اس نمائندہ حقیقت کو مزدور طبقے سے وابستہ کر دیا گیا۔ ترقی پسند عہد کی نمائندہ حقیقت مزدور نہیں کسان ہے۔ آج ہمارے دور کی نمائندہ حقیقت بھی کسان ہے لیکن پریم چند کے زمانے سے آج یہ حقیقت زیادہ پہلو دار ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ترقی پسند تنقید کے مختلف میلانات کا جائزہ لیا اور بتایا کہ تنقید میں حکیمانہ نقطہ نظر توازن اور اعتدال ضروری ہے اور زندگی کے تقاضوں کے سنجیدہ مطالعہ کے بغیر تنقید کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن نہیں۔

ہندی شاعر ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی نے فرمایا کہ ترقی پسند ادب پر نعرہ بازی کا الزام ہے مگر اول تو نعرہ لگانا اس قدر آسان اور معمولی کام نہیں ہے جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے کیونکہ نعرہ موجودہ حالات کے صحیح تجزیہ کے بعد دیا جا سکتا ہے اور یہ صورت حال کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ترقی پسند ادب پر محض نعرہ بازی کا اطلاق ناممکن ہے اچھا ادب عصری صداقتوں سے عبارت ہوتا ہے اور اعلیٰ ادب محض فرد کی ذات کا آئینہ دار نہیں ہوتا بلکہ ذات کی توسیع کرتا ہے۔

مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے شریف احمد صاحب نے فرمایا کہ اس بحث میں جدیدیت کا ذکر ضرورت سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں ترقی پسند میلانات اور ان کے مسائل پر پوری توجہ کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر نعمان صدیقی نے سوال اٹھایا کہ ترقی پسند تحریک کے ہر رکن کے لئے مارکسی نقطۂ نظر خصوصاً مارکس کے فلسفۂ تاریخ کو تسلیم کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۸ء تک ترقی پسند تصورات کا ارتقا کس شکل میں ہوا ہے اور ان میں کس قدر اضافہ یا ترمیم عمل میں آئی۔ اور آج کے حالات میں ترقی پسندی کی تعریف اور حد بندی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے باہمی تعلق کی نوعیت کو واضح کرنا بھی ضروری ہے۔

کنور پال سنگھ نے کہا پرانے مارکسی اور ترقی پسندوں میں بہت سے آج تعصب اور عصبیت اور تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ سوال بھی اہم ہے کہ ٹراٹسکی نے ادب کے بارے میں جن نظریات کو پیش کیا تھا انھیں محض سماجی حقیقت نگاری کے ذریعہ رد کر کے احتساب کا شکار بنایا گیا ہے آج ان پر دوبارہ غور ہونا چاہیے۔ تیسرے یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ ادب اور حقیقت میں بنیادی اور اوپری ڈھانچے کی نسبت قائم ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔

ڈاکٹر روبندر بھرمر نے کہا کہ ترقی پسندی جبر و احتساب یا محض لیبل پرستی نہیں ہے۔ سیاسی فارمولا بھی نہیں ہے بلکہ نئی صورت حال کو سمجھنے اور نئی سماجی آگاہی کو ادبی بصیرت میں ڈھالنے کی کوشش ہے۔ جدید ہونا مشکل ہے اور عصری ہونا آسان ہے کیونکہ عصری ہونا محض حیاتیاتی معاملہ ہے جبکہ جدید ہونے کے لئے نئے مسائل کو بھی سمجھا اور جھیلا جاتا ہے۔

اختر عالم خاں نے اس ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ ہندوستان کے اور خاص طور پر بیرونی ممالک کے حالات کے پیش نظر ترقی پسندی اور ادبی نظریات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ پچھلے زمانے میں ترقی پسندی کا عروج فاشزم کے خلاف متحدہ جمہوری محاذ کے عروج کے ساتھ ہوا تھا۔ آج حالات مختلف ہیں آج خود سوشلزم کے دائرے میں مختلف بحثیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ترقی پسندی کے دائرے میں شامل ہونے کے لئے مارکس کے نظریات کو قبول کرنا لازمی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسندی کوئی جامد فارمولا یا مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ در اصل ایک نقطۂ نظر ہے اور اس نقطۂ نظر کی تعبیر اور توجیہہ ظاہر ہے مختلف حالات میں مختلف طریقوں پر کی جائے گی۔ آج کے ہندوستان میں ترقی پسندوں کے تقاضوں کو جاننے اور اس کے خدوخال کو پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ آج کے ہندوستان کی تصویر پیش نظر ہو۔

ہندوستان کو باوقار اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک بنانے کی جدوجہد محض اقتصادی نہیں بلکہ نظریاتی اور تہذیبی جدوجہد بھی ہے اور اس جدوجہد میں ایک طرف ترقی پسند قوتوں کو اپنے صاحب اقتدار عناصر

کے خلاف لڑنا پڑے گا جو ہندوستانی ذہن کو صحیح معنوں میں جدید یا ترقی پسند اور سائنٹفک ہونے سے روک رہے ہیں۔ دوسری طرف ان عناصر سے لڑنا پڑے گا جو کبھی ہندوستان کی روحانیت کی دہائی دے کر اس کی پس ماندہ زراعت اور رجعت پسندانہ نظریات کو دل فریب اور خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر نامور سنگھ نے کہا کہ شمالی ہندوستان کے دانشوروں پر اس دور میں خاص طور پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان علاقوں میں عوامی تحریکیں کمزور ہیں اور اسی وجہ سے طرح طرح کے غیر صحت مند رجحانات فضا کو مسموم کر رہے ہیں اس صورت حال میں ترقی پسندوں سے نئی آگاہی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ادب میں مختلف تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ترقی پسند فنکار تکنیک میں تجربوں کے منکر کار دال ہیں جو لوگ جدیدیت کا تذکرہ ترقی پسندی کی مخالف تحریک کی شکل میں کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ اس تحریک کے امام ایلیٹ ہی نہیں برشٹ بھی ہیں اسی صف میں بورکا اور لوئی اراگاں بھی ہیں انھوں نے کہا کہ خود سارتر نے اس بات کو واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ آج کا فلسفہ تو مارکسیت ہے وجودیت محض ایک نظریہ ہو سکتا ہے۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

تیسری نشست کا آغاز محمد ظفر الرحمٰن قدوائی نے کیا انھوں نے کہا کہ فنکار کو وہی کرنا چاہئے جو اس کا ضمیر کہے۔ اگر وہ ایسی قدروں پر ایمان رکھتا ہے جو ظلم و ناانصافی کی مخالف ہیں تو وہ جو کچھ لکھے گا وہ ترقی پسندی سے بھرپور ہوگا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے مقالے میں ترقی پسندی کی مختلف توضیحات پر غور کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند فنکار اور ناقد ماضی کی خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن ماضی سے تعلق استوار کر کے صرف اس کی تعریف کرتے رہنے میں خطرات ہیں یہ راستہ ہمیں احیا پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ ترقی پسندی تاریخ کو ایک زندہ حقیقت کی شکل میں مانتی ہے اور وہ ماضی کے ادبی خزانے کو خام مال تصور کرتی ہے جس سے نئی عمارت کی تشکیل ہوتی ہے۔

بحث کا آغاز کرتے ہوئے قاضی عبدالستار نے کہا کہ ترقی پسند نقادوں نے ... چیخوف اور خاص طور سے نئی کہانیوں کو ایمانداری سے نہیں پرکھا ہے سردار جعفری نے سماجی جبر کی جو تعریف کی ہے اسے رومان اور انقلاب سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ فنکاروں کی نئی پود ہدایت نہیں چاہتی بلکہ سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کہا کہ ہمیں اپنے کلاسیکی ادب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ مارکس نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی کہیں بھی وضاحت نہیں کی ہے اس وجہ سے مارکسی نقطۂ نظر پر غور کرتے ہوئے آمریت کے خطرے کو بھی سامنے رکھنا چاہئے تخلیقی صلاحیت رکھنے والے فنکار کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مسائل و واقعات کو اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ سمجھ سکے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی رائے تھی کہ ہمیں نئے اور پرانے ترقی پسندوں کے درمیان بنیادی اختلافات پر زیادہ زور نہیں دینا چاہئے بلکہ یہ بات پیش نظر ہونی چاہئے کہ اس دور میں سماجی انصاف کی مانگ کے راستے میں کون سی طاقتیں حائل ہیں ان طاقتوں کے کون لوگ ساتھی ہیں اور ان کا کون مخالف ہے۔ ڈاکٹر ظہیر ... کا کہنا تھا کہ نئی ترقی پسندی سیاسی فارمولوں پر زور نہیں دیتی اس کا رجحان ایک نئے رویے اور نئے خیالات پر زیادہ ہے اس نشست کے صدر سید سجاد ظہیر نے کہا کہ ادبی مسائل کا حل ادبی شکل ہی میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ آج کی ترقی پسندی ۱۹۳۶ء کی ترقی پسندی نہیں ہو سکتی ہے۔ ادب میں نئے تجربات کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں اس کا استقبال کرنا چاہئے جدیدیت صرف ہیئت اور فارم کا مسئلہ نہیں اس لئے اس میں کچھ اچھے اور کچھ برے کی تمیز کرنی ہی پڑے گی جدیدیت کے سلسلہ میں لوگ یورپ کے فنکاروں کا ذکر کرتے ہیں اور ترقی پسند جدید فنکاروں مثلاً برشٹ دازنوسکی پوچشنکو پال الیار، لوئی اراگاں یا امریکہ کے فاکنر آرتھر ملر اور ہمنگ وے تک کو فراموش کر دیتے ہیں آخر میں انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ اس سیمینار کا اثر ترقی پسند تحریک اور تہذیب پر پڑے گا اور یہ سیمینار اس قسم کی کوششوں کا صرف آغاز ثابت ہوگا۔

چوتھی نشست مشاعرے کے لئے وقف تھی۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر، پبلشر ... نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا